Tarseel, Vol.17 (ISSN: 0975-6655)
A Peer Reviewed Research Journal of Urdu
Listed in UGC-CARE
Directorate of Distance education,
University of Kashmir

ناول ''بستی'': ایک ناسٹلجیائی مطالعہ

ڈاکٹر اسماء بدر

تلخیص

ناسٹلجیا ادب کا ایک اہم اور بنیادی فکری رجحان کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اردو ادب کا بیشتر سرمایہ ماضی، ماضی کی تلخ وخوشگوار یادوں، تجربات اور وابستگیوں وغیرہ کو محیط ہے۔ ناول جو اردو فکشن کا سب سے وسیع اور طاقت ور بیانیہ ہے، میں بھی اس رجحان کی تمام تر باریکیوں کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے ناول نگاروں میں انتظار حسین کی تخلیقات اردو ادب کی روایت میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے ناولوں میں جو موضوع غالب صورت میں سامنے آیا ہے وہ یقیناً ناسٹلجیا اور اس سے وابستہ دوسرے اہم عناصر ہیں۔ اس حوالے سے ناول ''بستی'' کا مطالعہ بہترین نتائج کا حامل ثابت ہوسکتا ہے۔

کلیدی الفاظ:

ہجرت، ثقافت، ذاتی تشخص، مہاجرین، ناسٹلجیا

ہجرت سے انسان کی وابستگی ازل سے ہی رہی ہے۔ انسان نے مختلف ضرورتوں کے تحت یا پھر جنگ کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت اور سفر اختیار کیا۔ ماضی کے اوراق پلٹنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتداء سے ہی انسان حکمرانی کے نشے میں دولت کے حصول کے لیے لوگوں کو ظلم واستبداد کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ چنانچہ ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے یا پھر معاش

کے حصول کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کی وجہ سے ان گنت ہندو مسلم ہجرت کے کرب سے گزرے۔ کتنے ہی قافلے راہ میں ہی برباد ہو گئے اور جو زندہ بچ گئے انہیں سر چھپانے کو مکان تک میسّر نہ ہوا، نہ پہننے کو لباس اور نہ کھانے کو خوراک تھی۔ ان مسائل نے فرد کو انتشار میں مبتلا کر دیا اور اسی انتشار سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ماضی کو یاد کر کے اور آسودہ لمحات کی بازیافت سے موجودہ ایام کے کرب کو کم کرنے کی سعی کرتا ہے اور ایسے میں ان ہجرت زدوں کے ہاں ناسٹلجیا جنم لیتا ہے۔ اس حوالے سے انتظار حسین کے اکثر تخلیقی کارناموں میں ہجرت کا کرب اور دکھ بیان ہوا ہے۔ دراصل انہیں خود بھی ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا تھا۔ انتظار حسین کو محض ایک یا دو ہجرتوں کا سامنا ہی نہیں رہا بلکہ بچپن میں ہی انہیں اپنے شہر ڈبائی سے ہجرت کر کے دوسری جگہ (ہاپوڑ) جانا پڑا۔ دوسری ہجرت انہوں نے عنفوانِ شباب ۱۹۴۱ء میں ہاپوڑ سے میرٹھ کی۔ زندگی کی یہ اوّلین ہجرتیں اگرچہ ایک لحاظ سے ان کے لیے باوجود اپنی سرزمین یا بستی سے جدا ہونے کے ،خوش آئند تغیرات سے لبریز تھیں لیکن ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے انہیں اپنے دیار سے ہمیشہ کے لیے جُدا کر دیا تھا جسے بُھلانا اِن کے لیے ناممکن تھا۔ اس ہجرت کی وجہ سے انہوں نے صدیوں کی تہذیب کو مٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے نزدیک ترکِ وطن اور ہجرت کا جو عمل ۱۹۴۷ء میں شروع ہوا تھا وہ صرف کسی ایک فرد کا، ایک شہر، فضا اور ماحول سے نکل کر دوسرے شہر، ملک اور ماحول میں آباد ہونے کا نام نہیں بلکہ پورے خاندانوں، گھرانوں اور روایتوں کا اپنی صدیوں پُرانی تہذیب سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا عمل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہجرت کا احساس ان کی تخلیقات کا ایک اہم ترین محرک بن گیا ہے۔ اس ضمن میں ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ''دیگر فنکاروں کے ناولوں میں ناسٹلجیا کے صرف اشارے ملتے ہیں مگر اپنے ناولوں میں انتظار حسین انھیں رجحان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایک ایسا رجحان جس کے تحت اہم کردار ماضی میں ڈوبے رہتے ہیں اور حال کو اسی آئینے میں دیکھ کر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ سب اپنی جڑوں کی تلاش میں ہوں۔ کبھی محسوس ہوتا ہے گویا یہ سب ہندوستان کے اسی سکون کے متلاشی ہوں، جس کی خاطر انھوں نے ہجرت کی تھی۔ دراصل ماضی کا شدید احساس ہر اس شخص کی سوچ کا حصہ ہوتا ہے جو ہجرت سے گزرا ہو۔ افراد اور اشیاء ہجرت کرنے والے کے ذہن سے محو نہیں ہو سکتے۔ پُرانے واقعات یادوں کا حسین خزانہ ہوتے ہیں جن میں با

ربار پناہ لینے کو ان کا جی چاہتا ہے۔''[۱]

انتظار حسین کا ناول ''بستی''، تقسیم ہند سے متعلق ناولوں میں ایک اہم ناول ہے۔ ناول ''بستی'' (۱۹۸۰ء) میں ناسٹلجک رجحان بھرپور طریقے سے سامنے آتا ہے۔ اس ناول میں انتظار حسین نے مہاجرین کی پریشانیوں، ذہنی الجھنوں، غم واندوہ، جذباتی کشمکش اور دورانِ سفر میں سامنے آنے والے الم ناک مسائل کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ناول کا پہلا حصہ روپ نگر کی یادوں پہ مشتمل ہے جس میں تحریکِ آزادی کے دوران عوام کی آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کے ساتھ اپنے کھوئے ہوئے تہذیبی ورثے کو پھر سے پانے کی جستجو اور جدوجہد سے قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ روپ نگر جو ذاکر کا آبائی علاقہ رہا ہے، میں کئی عرصہ رہنے کے بعد والد کے تبادلہ کی وجہ سے دوسرے علاقے بیاس پور چلا جاتا ہے۔ چھٹیوں کے دوران ذاکر اپنی خالہ کے گھر (جو روپ نگر میں تھا) چلا جاتا ہے۔ وہاں خالہ زاد بہن (صابرہ) کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اسی دوران ہندوستان میں فسادات برپا ہوجاتے ہیں اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد مختلف علاقوں سے ہندوستانی ہجرت کر کے سرحد کے پار جانے کی سعی کرتے ہیں۔ اس میں ایک خاندان ذاکر کا بھی ہے۔ ذاکر کے کرب اور ناگفتہ بہ حالات ومسائل کو ناول نگار نے ذاکر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ذاکر اپنے والدین کے ساتھ یو۔ پی کی ایک بستی روپ نگر سے ہجرت کر کے لاہور آتا ہے جب کہ اس کی پسند صابرہ پاکستان آنے سے انکار کر دیتی ہے۔ صابرہ کو دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت مل جاتی ہے اور وہ اکیلی ہندوستان میں رہ جاتی ہے۔

ہجرت کے کرب میں ڈوبا ہوا یہ ناول قاری کو بار بار ماضی کی جانب پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ''بستی'' میں انتظار حسین مہاجروں کی مجروح وشکستہ زندگی اور روح کو ماضی کے دریچوں سے دیکھتے ہیں۔ ''بستی'' ان کے ناسٹلجیائی رجحان کی ساخت وپرداخت میں نمایاں رہا۔ انتظار حسین نے خود اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''ہجرت اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ کیا میں ہجرت کو بھول جاوں؟ اگر ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں تو کیا میں ۱۹۴۷ء کو فراموش کر دوں؟ اگر میں اسے بھول گیا تو پاکستان میرے لئے بے معنی ہوجائے گا۔ جس تاریخ کے پیٹ سے پاکستان پیدا ہوا ہے، اس تاریخ کو لوگ کہتے ہیں کہ میں بھول جاوں، حالانکہ یہ تو ناجائیز اولاد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بھول جائے۔''[۲]

انتظار حسین کے یہاں ناولوں کے ساتھ ساتھ افسانوں میں بھی ناسٹلجیائی رجحان حاوی نظر آتا ہے اور یہ رجحان ہجرت

کے تجربے سے ہی راہ پا گیا ہے۔ دراصل انتظار حسین خود ان مہاجرین میں شامل تھے جو ہندوستان کی سرزمین چھوڑ کر پاکستان چلے گئے اور حقیقت میں یہی ''ہجرت'' کا تجربہ انتظار حسین کے فن کا بنیادی تجربہ بن گیا جس سے ان کے ناولوں میں ناسٹلجیا کی بنیاد پڑی۔ انتظار حسین کے ناول ''بستی'' میں سب سے پہلے ناسٹلجیائی رویّے نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں اور اس کے بعد دوسرے ناول ''تذکرہ'' ۱۹۸۷ء میں بھی یہ اثرات اپنی لیل ونہار کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض ان دونوں ناولوں میں ناسٹلجیا کا تھیم مشترک ہے۔ ان میں تقریباً ہر جگہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ناسٹلجیا کا گہرا رنگ ملتا ہے۔ وہ ماضی کی روح اور انسانی وجود کے اس حصے کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں جو کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اور جس کے بغیر انسانی وجود نامکمل ہے۔ ان کا فن زیادہ تر یو۔ پی کے مسلم مہاجرین کی فراریت اور ناسٹلجیائی جمود کا عکاس ہے جو نئی حقیقتوں کو نہ اپنا کر ماضی کے مزاروں کے مجاور بنے ہوئے ہیں۔ دراصل ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مسلمان نہ صرف ذہنی انتشار کے شکار ہوئے بلکہ اپنے آباواجداد کی یادگار، ہندو مسلم کلچر اور تاریخ کی زندہ جاوید شہادتوں سے بھی منقطع ہو گئے۔

انتظار حسین کا زیرِ بحث ناول ''بستی''، ہندو پاک کے مہاجرین کے درد و کرب، ان کی نفسیاتی الجھنوں، تہذیبی شکست وریخت، آبادی میں ویرانی کا احساس وغیرہ کو محیط ہے۔ ہجرت کرنے والے اپنے پیچھے صرف اپنا وطن ہی نہیں بلکہ ایک ہری بھری کائنات چھوڑ آئے تھے۔ انتظار حسین کا بنیادی سروکار ہجرت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدہ نفسیات سے ہے۔ محمد عالم خان رقمطراز ہیں:

> ''ہجرت انتظار حسین کا تخلیقی تجربہ بن گئی ہے۔ اپنے دیس کے گلی کوچے اور دوست انہیں بے طرح یاد آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کہانی لکھنے بیٹھتے ہیں تو شعوری طور پر شاید لاشعوری طور پر بار بار ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہجرت اور تہذیبی گمشدگی ان کے تخلیق کے محرک ہیں۔ ہجرت کا عمل انہیں ہر طرح ہانٹ haunt کرتا ہے کہ انہیں ماضی کا ناسٹلجیا ہے۔''[۳]

بقولِ سلیم اختر:

> ''انتظار حسین کے نزدیک فرد مجموعہ ہے اس کی یادوں کا اور یادیں ثمرہ ہیں ماضی کا۔ اسی لئے انتظار حسین ماضی کو فراموش نہیں کر سکتا ہے اور بار بار ناسٹلجیا کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن انتظار حسین کے لئے ماضی محض ایک فرد کا ماضی نہیں بلکہ وہ تو زماں کے تسلسل میں ایک لہر جتنی بھی اہمیت

نہیں رکھتا۔ اسے اجتماعی ماضی سے دلچسپی ہے، وہ ماضی جو ایک قوم کا ہے، ایک ملک کا ہے اور جس کا تحریری روپ تاریخ کہلاتا ہے۔''[۴]

ان اقتباسات سے مترشح ہوتا ہے کہ انتظار حسین کا غم، جو وہ ماضی کے حوالے سے اپنے سینے میں پالتے آئے ہیں، اُن کا نہیں ہے بلکہ اُس غم میں زمان و مکان بھی شامل ہیں۔ غرض انتظار حسین کا غم انفرادی نہ رہ کر اجتماعی ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ اس غم کی وسعت اتنی اور ایسی ہے کہ اِسے اپنے زمانے کا آئینہ تصور کیا جانا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین نے اپنے سینے میں سارے جہاں کے غم کو جگہ دی ہے۔ امیر احمد امیر مینائی کا مشہورِ زمانہ شعر ہے ؎

خنجر کہیں بھی چلے تڑپتے ہیں ہم اسیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دراصل انسان کی جنم بھومی، جہاں وہ طبعی اور شعوری آنکھ کھولتا ہے، بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس مٹی کے ساتھ اس کا ناطہ اٹوٹ ہوتا ہے اور اگر اسے ہجرت کا کرب جھیلنا پڑے تو یہ رشتہ ماضی کا حصہ بن کر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ ناول ''بستی'' کا بنیادی ماخذ ہجرت سے پیدا ہونے والی وہ ذہنی اور نفسیاتی کشمکش ہے جو مہاجرین کا نصیب ہوتی ہے اور اس کشمکش سے وہ ماضی کی یادوں کے حسین نگار خانے میں داخل ہو کر چند لمحوں کے لیے طرب و مسرت کے خزانے لوٹنا چاہتے ہیں۔ ذاکر کو صابرہ (خالہ زاد بہن) کی یاد بھی بہت بے چین کرتی ہے اور یادوں کی گھنی بدلی پھر اُمنڈنے لگتی ہے:

''یادوں سے بھرے دل و دماغ کے ساتھ اس نے کچھ سنا کچھ نہ سنا۔ وہ تو یادوں کے منطقے اسے ایسے واپس آیا تھا۔ جیسے سوتے سوتے، کوئی دفعتاً جاگ اٹھے مگر نیند اُسی طرح آنکھوں میں بھری ہو۔۔۔۔ یادوں کی پریاں اس کے اردگرد منڈلا رہی تھیں۔ پھر صابرہ اس کے تصور میں چل پھر رہی تھی۔ جب وہ تھوڑے سے دنوں کے لیے ویاس پور آئی تھی۔ ان دنوں ہم دونوں آپس میں گُل مل گیے تھے۔۔۔۔۔۔ ہم دونوں منڈیر سے لگے سر سے سر جوڑے کھڑے رہتے۔ سیٹی دیتے، دھواں اگلتے انجن کے جلو میں حرکت کرتے منور ڈبوں کو دیکھتے رہتے۔ دن کو یہ ڈبے الگ الگ دکھائی دیتے۔'' [۵]

ہندوستان کی تقسیم کے بعد ذاکر اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان کے ایک شہر لاہور ہجرت کرتے ہیں۔ ذاکر اپنا وطن

چھوڑ کر نئے وطن چلا جاتا ہے لیکن ایک نئی شخصیت کے ساتھ کیونکہ ہجرت کا تجربہ انسان کی شخصیت کی قلب ماہیت کرتا ہے۔ ذاکر ہجرت کے بعد بہت دنوں تک خود سے اور ماضی سے بیگانہ رہتا ہے لیکن اچانک یادیں اسے گھیر لیتی ہیں اور وہ مستقل ماضی کا سفر کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ہو رہے انتشار سے خوف زدہ ہے اور اس پر روک لگانا چاہتا ہے۔ اپنے وجود کی تمام جہات کو اکھٹا اور ہم آہنگ دیکھنے کا متمنی ہے۔ اس لیے اس کی بستی (روپ نگر) اس کی یادوں میں ایک کرسٹل کی طرح منور ہے، ایک ایسی ضو جو اس کی حالیہ زندگی کو معنویت عطا کرتی ہے۔ دراصل حالات کی ابتری سب سے زیادہ انسانی باطن پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ ایسے میں خود کو سنبھالے رکھنے کے لیے اور اپنی ذات کی کُلیت کو بچانے کے لیے اور وجود بامعنی بنائے رکھنے کے لیے ماضی اور اس کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ ذاکر کی یادیں نہ صرف یہ کہ مرکز سے اس کے بُعد کو کم کرنے کا وسیلہ ہیں بلکہ ذات کی بازیافت سے بھی عبارت ہیں۔ اس کی ذات صرف زمانہ حال میں ہی پھیلی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مضبوط سرا اس ذاتی ماضی (روپ نگر) سے ہوتا ہوا اجتماعی ماضی (تاریخ، تہذیب، عقائد و توہمات) تک پہنچ جاتا ہے اور ہجرت کے بعد زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ جیسے:

> ''یار کتنی عجیب بات ہے کہ وہی ایک بستی اپنے ایک باسی کے لئے ہجرت کر گیا، پہلے سے بڑھ کر بامعنی ہو گئی ہے کہ وہ اسے خوابوں میں دیکھتا ہے۔۔۔۔ ہجرت نے روپ نگر کو کتنا بامعنی بنا دیا ہے۔''[۶]

اس ناول میں اُن دنوں کا ذکر ہے جب پاکستان تعمیر و تشکیل کے منازل طے کر رہا تھا اور کروڑوں مسلمانوں کے خوابوں کی تعبیریں آشکار ہونے کو بے تاب تھیں۔ مہاجرین کے قافلے مسلسل ہندوستان سے آ رہے تھے پہلے تو دلوں میں پُرانی مروتیں اور وضعداریاں باقی تھیں مگر آہستہ آہستہ وہ سوختہ ہوتی گئی اور ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی و ہم نشینی کے جذبات و احساسات بھی کمزور پڑنے لگے:

> ''روز کوئی قافلہ شہر میں داخل ہوتا اور گلیوں محلوں میں بکھر جاتا۔ جسے جہاں سر چھپانے کے لئے کونہ مل گیا وہیں پسر گیا۔ جسے کشادہ مکان میسر آ جاتا وہ اپنی خوشی سے پھر مروت میں آنے والوں کو پناہ دیتا چلا جاتا، یہاں تک کہ وہ کشادہ مکان تنگ نظر آنے لگتا۔ پناہ لینے والے پوری داستان سناتے پھر پناہ دینے والے پناہ لینے والے مل کر انہیں یاد کرتے جنہوں نے زمین اور اپنے گھروں کو اور بزرگوں کی قبروں کو نہیں چھوڑا۔ انہیں دھیان میں لاتے جو ساتھ ساتھ نکلے

تھے مگر راستے میں بچھڑ گئے اور جنہیں وہ اجنبی راہوں میں بے گور وکفن چھوڑ آئے تھے۔'' ؎

اس اقتباس سے وہ دردناک اور غضب ناک تصویر ذہن میں صاف ہوتی ہے جو تقسیم کے نتیجے میں لوٹ مار اور بربریت کے نتیجے میں متشکل ہوئی۔ دراصل ۱۹۴۷ء میں جو برصغیر کی تقسیم ہوئی، اُس کے اثرات اتنے دوررس تھے کہ یہ بعد میں ایک انسانی جسم کی تقسیم کی طرح تصور کیا جانے لگا کیوں کہ ماں لشتم پشتم کر کے پاکستان پہنچ گئی اور باپ ہندوستان میں ہی یاس وناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ بہن ہندوستان میں بلوائیوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی اور بھائی ہجرت کے دوران اکثریتی طبقے کے غیض وغضب کا نشانہ بن گیا۔ ہجرت کے ایسے دل دہلا دینے والے واقعات کا ذکر سردار شوکت حیات خان نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''گم گشتہ قوم'' میں نہایت ہی دردناک انداز میں اس طرح کیا ہے:

> ترن تارن پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ پورا شہر جل رہا ہے۔ وہاں کی مسجدیں اور سڑکوں کے کنارے مسلمانوں کی لاشوں سے اٹے پڑے ہیں، گورا کھار جمنٹ جوان کی حفاظت پر تعینات تھی، غیر متعلق اور لاپرواہیانہ انداز دکھائی دی۔ رجمنٹ کا انچارج میجر ون کے وقت سو رہا تھا جبکہ قتل وغارت اپنے عروج پر تھا۔ میں نے ایوب سے کہا جا کر اسے جگاؤ۔ بجائے اس کے کہ ایوب اسے فوجی حکم دیتا اس نے میجر سے کہا ''میجر اٹھو باہر منتخب شدہ عزت مآب وزیر تمہارے انتظار کر رہے ہیں'' میں نے میجر کو اس کی سنگدلی پر بری طرح جھڑکا کہ وہ دن کے سو رہا تھا جبکہ لوگ قتل ہو رہے ہیں۔ اب ہمارے لئے کرنے کا صرف ایک ہی کام تھا کہ ان مسلمانوں کو جو زندہ باقی بچے ہیں قصبے سے باہر نکال کر بسوں میں سوار کرایا جائے۔ میں نے انہیں ڈبل مارچ کا حکم دیتے ہوئے صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی۔''

آگے کہتے ہیں:

> ایک گھنٹے بعد میں نے دیکھا کہ بسیں مردوں اور سامان سے بھر چکی تھیں۔ جبکہ عورتیں اور بچے باہر تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے سب مردوں کو بسوں سے باہر نکالا۔ ان کا سامان باہر پھنکوا دیا اور انہیں بتایا کہ پہلے اپنی عورتیں اور بچوں کو بسوں میں سوار کراؤ اور تمام مرد امرتسر تک ہماری حفاظت میں پیدل جائیں گے۔۔۔۔۔ امرتسر میں ہم نے

سنا کہ کٹڑہ ماہن سنگھ کو گھیرے میں لے کر سکھ قتل وغارت کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ میں نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ لوگوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی اس لئے کہ وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ایک سکھ ہر طرف اندھا دھند گولیاں چلا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ آگے جا کر میں حالات کا اندازہ لگاتا ہوں۔ لوگوں نے کہا یہ عمل خطرناک ہوگا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی کی فکر نہ تھی۔ میری زندگی ان لوگوں کی زندگیوں سے زیادہ قیمتی نہ تھی جو بے بسی کے عالم میں قتل ہو رہے تھے۔''۸

ناول ''بستی'' دراصل ان لمحوں کو یاد کرنے کے عمل سے وابستہ ہے جنہیں وقت نے دور کر دیا۔ انتظار حسین کی دانست میں یاداشت انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد ہے۔ یاداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا اور ماضی نہ ہو تو بنیاد اور جڑ میں کچھ نہیں رہتا۔ اس ناول میں انتظار حسین کے شعور واحساس کے ذریعہ ایک گمشدہ دنیا پھر سے اپنے خدوخال کے ساتھ نکھر کر سامنے آتی ہے اور بامعنی بن جاتی ہے۔ گمشدہ مقامات اور رشتوں کی یاد ایک ٹیس بن کر ابھرتی ہے:

''جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا۔ روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا کچے پکے راستے جو جانے کہاں جا کر نکلتے تھے، بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے، ڈولتے، ہچکولے کھاتے اکے، اونگھتی رینگتی بیل گاڑیاں، کوئی کوئی رتھ کہ اس میں جتے توانا بیلوں کی گردنوں میں آویزاں گھنٹیوں اور گھنگھروں کی بدولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے تھے، کالا مندر، کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل، کربلا کی ویران اور اداس فصیل ٹیلوں والا قلعہ، راون بن کے بیچ کھڑا بھید بھرا بھرگد، ایک پورا دیو مالائی عہد جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا۔''۹

ناول بستی میں روپ نگر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ذاکر اور دیگر کرداروں کے دل اور ذہن پر نقش ہے۔ برس ہا برس کے بعد بھی یہ نقش اس طرح تازہ ہیں جیسے زندگی کے منظرنامے پر پہلی بار ظاہر ہوئے تھے اور جب ماضی کا کوئی واقعہ یاد آجاتا ہے تو اس سے متعلق افراد کے لب ولہجہ تک کو تفصیل سے دہرایا جاتا ہے۔ روپ نگر سے آنے والوں نے خود کو اس شہر سے جڑے رکھا۔ ذاکر کو جنگ کے دنوں میں لالٹین کی روشنی سے روپ نگر کی یاد ستاتی ہے۔ حال میں وہ لالٹین کی روشنی سے خائف ہے لیکن ماضی کی یاد آتے ہی لالٹین سے وابستگی پیدا ہو جاتی ہے:

''لالٹینوں کے زمانے کو، جب ہمارے روپ نگر میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی اور اندر گھر میں بھی اور باہر گلی میں بھی لالٹین ہی کی روشنی ہوتی تھی، میں کس محبت سے یاد کرتا ہوں۔ بڑے ہو کر میں نے تعلیم کی ساری منزلیں لالٹین ہی کی روشنی میں طے کیں۔''[۱۰]

انتظار حسین کے اس اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قدیم وقت سے چلی آ رہی روایت اور ثقافت کو ترک کر دینا اتنا آسان نہیں۔ لہٰذا مہاجرین اس ثقافت کو لاشعوری طور پر پسند کرتے اور سراہتے ہیں۔ روپ نگر میں رہنے والے پاکستان آئے تو یوں محسوس ہوا کہ ساری کائنات وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقدار کے تباہ ہونے سے ان مہاجرین کے اندر ذہنی انتشار بڑھنے لگا ایسے میں مہاجرین نے قلبی اور ذہنی سکون کے لیے ماضی کا ہاتھ تھامے رکھا۔

انتظار حسین کا ناول محض یادوں کا نام نہیں بلکہ اپنی سرزمین سے بچھڑنے کا غم، مشترکہ تہذیب وثقافت کے زوال کا صدمہ، معاشرتی ناہمواری اور ہندو دیومالائی عناصر کے تاریخی وفلسفیانہ طرزِ فکر کو محیط ہے۔ ذاکر جلاوطنی کی زائیدہ نئے سماج کی ستم ظریفی اور ذاتی وذہنی خلفشار کا صاف وشفاف آئینہ ہے۔ ایک نئی سرزمین اور ایک نئے ملک میں پُرسکون اور خوش حال زندگی کا خواب چکنا چور ہوتے ہی وہ ماضی کی خوبصورت اور حسین یادوں کو اپنی زندگی کا اہم سرمایہ تصور کرتا ہے۔ ذاکر بے اطمنانی کی حالت میں کہتا ہے: ''یہ ہماری یادوں کی واپسی کا موسم ہے۔ جانے کب کب کی بھولی باتیں آتی ہیں، اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے؟''۔

فراق گورکھپوری کا یہ خوبصورت شعر ملاحظہ ہو:

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

آگے ذاکر ماضی کا سفر اس طرح کرتا ہے:

''مگر کمال ہے وہ اپنے آپ پر حیران ہونے لگا۔ باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے، میں اندر سمٹتا جاتا ہوں، کب کب کی یادیں آ رہی ہیں۔ اگلے پچھلے حصے، بھولی بسری یادیں، باتیں ایک کے ساتھ دوسری، دوسری کے ساتھ تیسری، الجھی ہوئی، جیسے آدمی جنگل میں چل رہا ہو۔ میری یادیں میرا جنگل ہیں۔ آخر یہ جنگل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ نہیں، میں کہاں سے شروع ہوتا

ہوں۔اور وہ پھر جنگل میں تھا۔جیسے جنگل کی انتہا تک پہنچنا چاہتا ہو، جیسے اپنا شروع تلاش کر رہا ہو۔''[۱۱]

ذاکراوراس کے والدین ان مہاجرین کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو جسمانی طور پر پاکستان میں تو بس تو گئی ہے مگران کی ذات کا ایک حصہ کٹ کر ماضی میں ہی رہ گیا ہے اسی لیے موجودہ معاشرے کی کوئی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو یادوں کے ذریعے واپس لاکر حال میں شامل نہ کیا جائے اوراسی لیے وہاں کے پیڑ، ساون کے جھولے،گلیاں ،مندر، بوسیدہ مدرسے اور ڈھول سے بھری پڑی پگڈنڈیاں لگا تار درد وکرب بن کر یادوں کے سہارے گشت کرتی رہتی ہیں:

''نیم کا پیڑ بھی میں نے دریافت کر ہی لیا۔مگر کوئل کی آواز پہلے سنی۔اس دیار میں وہ میرا پہلے پہل کوئل کی آواز سننا۔از کجاھی آیدایں آوازِ دوست''۔یہ واقعہ اس وقت شروع ہوا جب شام نگر سے نکل کر کرایئے کے مکان میں آباد ہوئے۔یہاں آس پاس کوئی متروکہ مکان نہیں تھا،اسی لیے اڑوس پڑوس میں کوئی مہاجر گھرانہ بھی نہیں تھا،تھوڑے ہی فاصلے پر درخت اچھی خاصی تعداد میں کھڑے نظر آتے تھے۔کوئل کی آواز سے میں نے شگن لیا کہ ان میں آم جامن کے پیڑ بھی ہوں گے۔کوئل کی آواز امی نے سنی تو عجب طرح کی چونکی۔''آئے تھئے! کوئل بول رہی ہے''۔پھر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگنے لگی ہیں۔کوئل کی اآواز میرے لئے کوئل کی آواز میرے لیے محکمہ بحالیات کا پروانہ بن گئی کہ اس کے بعد میں نے اس شہر میں دستا بستا چلا گیا۔مگر امی کے یہاں اس آواز نے مختلف اثر کیا سوئی ہوئی یادوں کو جگا دیا،، [۱۲]

اسی طرح ذاکر کے والد کی ہندوستان میں ایک بڑی حویلی تھی جس کی چابیاں ذاکر کی ماں آخر وقت تک اپنے پاس رکھتی ہے۔یہاں تک ایک زمانہ بیت گیا اور ذاکر کی ماں کو اپنی حویلی میں رکھی ہوئی آبائی چیزوں کا خیال آتا ہے۔ان چیزوں میں اپنے جہیز کا سامان، مدینہ منورسے لائی گئی جائے نماز، کربلائے مولا سے آیا ہوا کفن، اور خاک شفا کی سجدہ گاہ، وغیرہ شامل تھیں۔ان تمام اشیاء کو ہجرت کرتے وقت ایک کوٹھری میں رکھ کر تالا ڈال آئی تھیں اور اب وہ اس چابی کی متلاشی ہے۔ذاکر کے والدین اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارنے کے بعد ہجرت کرتے ہیں۔بہت زمانے کے بعد انھیں اپنی حویلی کے اس کمرے کی

چابی یاد آتی ہے، جس میں ان کے آباواجداد کی کئی نشانیاں رکھی ہیں۔ حالاں کہ وہ حویلی، وہ کمرہ اور اس میں رکھی چیزیں کافی پیچھے چھوٹ چکی ہیں، لیکن ذاکر کی ماں کو اب بھی یقین ہے کہ اگر کمرے میں بند پشتینی چیزوں کو نکال کر دھوپ لگا دی جائے تو وہ وراثت میں ملی چیزوں کے ذریعے اپنے ماضی کو محفوظ کر سکیں گی:

''ارے میں ایک مرتبہ تالا کھول کر چیزوں کو کم سے کم دھوپ تو لگا آتی۔ اتنا زمانہ ہو گیا کمبخت دیمک نہ لگ گئی ہو، اس گھر میں بہت دیمک تھی'' ۱۳

یعنی پچیس سال گزرنے کے بعد بھی اس کے ذہن میں وہ چیزیں ہیں جن سے اب اس کا کوئی واسطہ نہیں مگر وہاں کی محبت ابھی بھی اس کے دل میں موجود ہے۔ انتظار کے اکثر کردار جو ہجرت کر کے نئے وطن میں جا بسے ہیں ابھی تک نئے وطن اور اس کی تبدیل شدہ حقیقتوں سے مفاہمت نہیں کر سکے کیونکہ پرانی یادوں اور قدیم علامتوں کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ انتظار حسین نے ماضی کی بازیافت کے لیے اپنے اسلوب کو داستانوں، اساطیر اور دیو مالاؤں اور علامتوں سے بھی سجاتے اور سنوارتے ہیں۔ ان کی علامتیں اور کنائے بڑے عام فہم اور سادہ ہیں جو نہ تسلسل میں قانع ہوتے ہیں نہ قاری اس سے اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں بلکہ ان کی علامتوں سے نثر باوزن بنتی ہے اور تصویریں اختصار کے ساتھ قاری کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں۔:

''میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی، بیس اکیس کے لپٹے میں تھا، جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا، گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔'' ۱۴

یہ اقتباس تقسیم ہند کے بحران کے اس پہلو کو منکشف کرتا ہے کہ کس طرح دہائیوں پر محیط ذہنی اور جسمانی تبدیلی محض چند دنوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ صدمات اور المیوں کی اس یورش نے نہ صرف ایک عام انسان کی قلبِ ماہیئت کر دی بلکہ اُس کے خارجی زاویے بھی اس قدر بدل گئے ہیں کہ اُس انسان کو پہچاننا تک دشوار ہو گیا ہے۔ ہندوستان سے سفر کے دوران سے ہی اُس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ پاکستان وارد ہوتے ہی اُس پر سپیدی طاری ہو گئی۔

انتظار حسین کے کردار حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کرتے ہیں اور ہجرت نے انہیں تمام زندگی نئی جگہوں پر پُرانے مقامات یا اپنے آبائی وطن کی یاد دلائی۔ وہ بڑی فنکارانہ چابکدستی سے قاری کو ماضی کے سکون، فراغت، اور خوش حالی کی طرف

لے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ پورا ماضی حال کی شکل اختیار کرتا ہے۔اپنے وطن سے کوسوں دور وہ اپنے وطن کے شہر، گمشدہ معاشرے اور بکھرے ہوئے تہذیبی سانچوں کو یاد کرتا ہے۔جن کی آغوش میں وہ زندگی کے حسین دن گزار چکا ہے۔جلاوطنی کے نتیجے میں رونما ہونے والے تہذیبی زوال اور ناسٹلجیا نے بنیادی موضوع کا روپ دھارن کرلیا ہے۔ماضی کے معمولی سے معمولی واقعات کو بھی وہ نہ بھلا سکے۔ان کے یہاں حال اور مستقبل کے برعکس ماضی کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔

انتظار حسین کا ناول ''بستی''، تقسیم ہند کے بعد کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار ذاکر کبھی بھی اپنے وطن کو بھول نہ پایا اس کے اندر کی بے چینی نے اسے کسی پل قرار سے رہنے نہ دیا۔وہ جیسے اپنا سب کچھ اپنے شہر روپ نگر چھوڑ آیا تھا۔وہاں کی یاد اسے بے چین کئے دیتی ہے۔ان کے ہاں اس بستی سے ہجرت کے معنی ہیں اپنے وجود کے مرکز سے ہجرت کرنا۔ اس ضمن میں روبینہ پروین رقمطراز ہیں:

> ''مہاجر کا کل سرمایہ اس کا ماضی اور اس کی یاد ہوتا ہے۔وہ صرف اپنے گھر میں گزارے ایک ایک پل سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔دوست، رشتہ دار، عزیز، تہذیب، اور رسم ورواج جن سے انسان کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے، سب چھن جاتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے وجود میں ایک خلا محسوس کرنے لگتا ہے۔اس خلا کو پورا کرنے کے لیے مہاجر اپنے گزرے دنوں کو حسرت سے یاد کرتا ہے۔''۱۵

مجموعی طور یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشترکہ قدروں کا زوال، آبائی سرزمین سے دوری، آباواجداد کی قبریں چھوڑ کر ہجرت کا کرب ہمیں اس عہد کے اُن لوگوں کی یاد دلاتا ہے جو ماضی کی یادوں اور حال کی تلخ اور کربناک حقیقتوں کے درمیان الجھے اپنے وجود کی بے سروسامانی کا ماتم کرتے کرتے بے حال اور سکون کی تلاش میں بھٹکتے رہے۔وہ جسمانی طور پہ نئی جگہ میں آن بسے مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ چکا ہے اسی وجہ سے انہیں نیم کے پیڑ، ساون کے جھولے، آم کے باغات، متروکہ حویلیوں اور دھول پڑی پگڈنڈیوں کی یادیں مسلسل ستاتی رہتی ہیں۔اس ناول میں انتظار حسین نے تقسیم کو براہ راست موضوع نہیں بنایا، مگر تقسیم کے نتیجے میں پیدا شدہ بے زمینی اور اپنی جڑوں سے اکھڑ جانے کے کربناک احساس کو بہ حُسن وخوبی پیش کیا ہے۔''بستی'' میں ناسٹلجیا کا عنصر باقی تمام جذبات اور احساسات پر حاوی نظر آتا ہے۔ناول حقیقت میں یادوں کے کرب پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ ممتاز احمد خان: اردو ناول کے بدلتے تناظر۔ ویلکم بک پورٹ کراچی ۱۹۹۳ء۔ص ۲۴۲۔۲۴۳

۲۔ طاہر مسعود: ایک گفتگو، انتظار حسین، مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان، مرتب ارتضیٰ کریم۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ۱۹۹۶ء۔ص ۱۱۷

۳۔ محمد عالم خان: اردو افسانے میں رومانی رجحانات۔ علم و عرفان پبلیشرز لاہور۔ص ۶۱۰

۴۔ سلیم اختر: داستان اور ناول تنقیدی مطالعہ۔ سنگ میل پبلیکشنز لاہور ۱۹۹۱ء۔ص ۱۳۸

۵۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۱۷

۶۔ انتظار حسین، بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۱۴۴

۷۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۹۲)

۸۔ سردار شوکت حیات خان: گم گشتہ قوم۔ جنگ پبلیشرز لاہور ۱۹۹۵ء۔ص ۲۴۲۔۲۴۳

۹۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۴۱

۱۰۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۲۳

۱۱۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۱۲

۱۲۔ انتظار حسین، بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص، ۹۹

۱۳۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۱۵۰

۱۴۔ انتظار حسین: بستی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۲ء۔ص ۸۷

۱۵۔ روبینہ پروین: اردو ناول میں مہاجر کردار۔ عرشیہ پبلکیشنز، دہلی ۲۰۱۳ء۔۲۷۲

☆☆☆☆☆☆

رابطہ:

ڈاکٹر اسما بدر، استاد، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، سوپور، بارہمولہ